پس آخر میں اس قسم کی تمام تفاصیل کا خلاصہ صرف حرف نون تک جا کر منتہی ہو جاتا ہے کہ یہ سب درحقیقت الف کے بجائے نون رکھدیئے جانے سے پیدا ہوئی ہیں۔

لیکن اگر انسان اسپر غور کرنے لگے کہ دیگر مواضع قرآنی میں اس حرف سے کیا کیا حکمتیں مراد لی گئی ہیں، اور قرآن حکیم کے تمام حروف کے اندر کس قدر حکمتیں اور اسرار نہاں ہیں تو میرا ایمان ہے کہ انسان کی عمر ختم ہو جائیگی مگر وہ ایک حرف کے بھی پورے اسرار اور اس کی کنہ کو معلوم نہ کر سکے گا۔

منزل تمام گشت و بپایاں رسید عمر ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

مرآۃ المثنوی

مرتبہ

جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دار الترجمہ

مثنوی مولانا روم کا بہترین ایڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے مدعا اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے کئی انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں جنکی مدد سے آپ حسب منشاء جو شعر چاہیں نکال سکتے ہیں۔ ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے۔ غرض یہ کہ اس کتاب نے مثنوی شریف سے فائدہ اٹھانیکے لئے ایسی سہولت مہیا کردی ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطالب پر عبور حاصل کرسکتا ہے۔

کاغذ کتابت طباعت بہترین جلد نہایت اعلیٰ قیمت عـــہ انگریزی لعـــہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے

رسائل ومسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

(۶)

تخلیط وتلبیس اگر کوئی شخص یا گروہ اسلامی تمدن ومعاشرت اور مغربی تمدن ومعاشرت کے اصولی، مقصدی اور صوری فرق کو اچھی طرح سمجھنے اور دونوں کا ناقدانہ مطالعہ کرنے کے بعد علی وجہ البصیرت اسلام کو چھوڑ کر مغربی تمدن ومعاشرت کو اختیار کرے تو ہم کو اس سے تعرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اپنی رائے اور اپنے عمل میں مختار ہے، اور اگر کوئی شہد کو شہد اور زہر کو زہر جان لینے کے بعد زہر کو اختیار کرتا ہے تو شوق سے اختیار کرے لیکن ہمیں جس چیز پر اعتراض ہے وہ خلط مبحث اور تلبیس حق و باطل ہے۔ بعض لوگ ہیں جنہوں نے نہ اسلامی تمدن و معاشرت کے اصول ومقاصد کو سمجھا ہے، نہ مغربی طرز معاشرت کے اصول ومقاصد کو، اور وہ نادانی سے ان دونوں کو خلط ملط کر رہے ہیں۔ بعض دوسرے لوگ ہیں جو قصداً تلبیس سے کام لیے جا رہے ہیں، کیوں کہ ان کی خواہشات نفس ان کو مغربی تمدن ومعاشرت کے طریقے اختیار کرنے پر ابھارتی ہیں، مگر یا تو ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ علانیہ اسلام کو ترک کر دیں، یا وہ عام مسلمانوں کو دھوکہ دیکر اپنے ساتھ اس راستہ پر لے جانا چاہتے ہیں، اس لیے وہ اسلام کے اصول ومقاصد اور اس کے قوانین کے بالکل خلاف ایک طریقہ اختیار کرتے ہیں، اور پھر قرآن وحدیث کے احکام میں تحریف کی حد تک پہنچی ہوئی تاویلیں کرکے مسلمانوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ انہیں کا پسندیدہ طریقہ درحقیقت اسلام کا طریقہ ہے۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ سب سے پہلے

اس خلط مبحث کو ختم کیا جائے اور تلبیس و تخلیط کے تمام دروازوں کو بند کرکے ان حضرات کو مجبور کردیا جائے کہ وہ واضح اور نمایاں راستوں میں سے کسی ایک کو صاف اور سیدھے طریقے سے اختیار کریں، خواہ وہ اسلام کا راستہ ہو یا مغربی تہذیب و تمدن کا راستہ۔

مخالفین حجاب کے تین طبقات اس وقت مسلمانوں کے جس گروہ میں ترک حجاب اور آزادی نسواں کی تحریک پھیل رہی ہے وہ تین مختلف طبقات سے مرکب ہے، اور ہر ایک کا حال جدا گانہ ہے۔

انتہا پسند ایک طبقہ ان لوگوں کا ہے جو مغربی معاشرت کے اصول ثلثہ (یعنی مساوات مرد و زن، عورتوں کے معاشی استقلال اور دونوں صنفوں کے آزادانہ اختلاط) پر ایمان لا چکے ہیں اور انہی اصولوں پر اپنی معاشرت کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں، بلکہ عملاً شروع کرچکے ہیں۔ ان کے پیش نظر وہی مقاصد ہیں جو اہل مغرب کے پیش نظر ہیں، یعنی مادی فوائد اور حسی لذتیں۔ ان کے نظریات بھی وہی ہیں جو یورپ سے درآمد ہوئے ہیں۔ عورت کی تعلیم کا منتہا ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ کمانے کی قابلیت بہم پہنچائے اور اس کے ساتھ دل لبھانے کے فنون سے بھی کماحقہ واقف ہو۔ خاندان میں عورت کی صحیح پوزیشن ان کے خیال میں یہ ہے کہ وہ مشترک بجٹ میں اپنا حصہ پورا پورا ادا کرے اور مرد کی طرح خاندان کا کمانے والا رکن بن جائے۔ سوسائٹی میں عورت کا حقیقی مقام ان کی رائے میں یہ ہے کہ وہ اپنے حسن، اپنی آرائش اور اپنی اداؤں سے سوشل لائف میں ایک عنصر لطیف کا اضافہ کرے، اپنی خوش گفتاری سے دلوں کو حرارت بہم پہنچائے، اپنی موسیقی سے کانوں میں رس بھر دے، اپنے رقص سے روحوں کو وجد میں لائے اور تھرک تھرک کر اپنے جسم کی ساری خوبیاں آدم کے بیٹوں کو دکھائے تاکہ ان کے دل خوش ہوں، ان کی نگاہیں لذت یاب ہوں، اور ان کے ٹھنڈے خون میں تھوڑی سی گرمی آجائے۔ قوم میں عورت کی صحیح حیثیت ان کے اعتقاد میں یہ ہے کہ وہ سوشل ورک کرتی پھرے،

میونسپلٹیوں اور کونسلوں میں جائے، کانفرنسوں اور کانگریسوں میں شریک ہو، سیاسی اور تمدنی اور معاشرتی مسائل کو سلجھانے میں اپنا وقت اور دماغ صرف کرے، ورزشوں اور کھیلوں میں حصہ لے، تیراکی اور دوڑ اور کود پھاند اور لمبی لمبی اڑانوں کے ریکارڈ توڑے، غرض وہ سب کچھ کرے جو گھر سے باہر ہے، اور اس سے کچھ غرض نہ رکھے جو گھر کے اندر ہے۔ عورت کی زندگی کا یہ سارا پروگرام جو اپنے اصول و مقاصد سے لے کر اپنی عملی جزئیات تک بعینہٖ وہی ہے جو یورپ اور امریکہ میں مرتب ہوا ہے، ہر قسم کی تنقید سے بالاتر، بلکہ آئی ڈیل پروگرام سمجھ کر اخذ کیا گیا ہے، اور پھر لطف یہ ہے کہ اس کو عین مطابقِ اسلام قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ اسلام مادی ترقی میں مانع نہیں ہے، اور مادی ترقی کی کوئی صورت اس صورتِ خاص کے سوا متصور نہیں!

معتدلین | دوسرا طبقہ اعتدال پسندوں کا ہے جن میں آجکل نیم حجاب اور نیم بے حجابی کی ایک عجیب معجون مرکب استعمال کی جا رہی ہے۔ یہ لوگ مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ کے صحیح مصداق ہیں۔ ایک طرف تو یہ اپنے دلوں میں اسلامی جذبات رکھتے ہیں۔ اخلاق تہذیب شرافت اور حسن سیرت کے اُن معیاروں کو مانتے ہیں جن کو اسلام نے پیش کیا ہے، اپنی عورتوں کو حیا اور عصمت کے زیوروں سے آراستہ اور اپنے گھروں کو اخلاقی نجاستوں سے پاک رکھنے کے خواہشمند ہیں، اور ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جو مغربی تمدن و معاشرت کے اصولوں کی پیروی سے رونما ہوئے ہیں اور ہونے چاہئیں، مگر دوسری طرف اسلامی نظم معاشرت کے اصول و قوانین کو توڑ کر رکھتے، کچھ جھجکتے اُسی راستہ کی طرف اپنی بیویوں، بہنوں، اور بیٹیوں کو لیے چلے جا رہے ہیں جو مغربی تہذیب کا راستہ ہے یہ لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ آدھے مغربی اور آدھے اسلامی طریقوں کو جمع کر کے

یہ دونوں تہذیبوں کے فوائد و منافع اکٹھے کر لیں گے، یعنی ان کے گھروں میں اسلامی اخلاق بھی محفوظ رہیں گے، ان کی عائلی زندگی کا نظم بھی برقرار رہیگا، اور اس کے ساتھ ان کی معاشرت اپنے اندر مغربی معاشرت کی برائیوں کو چھوڑ کر صرف اس کی دلفریبیاں، اس کی لذتیں اور اس کی مادی منفعتیں بھی جمع کرلے گی۔ لیکن اول تو دو مختلف الاصل اور مختلف المقصد تہذیبوں کی آدھی آدھی شاخیں کاٹ کر پیوند لگانا ہی درست نہیں۔ کیونکہ اس طرح کے بے جوڑ امتزاج سے دونوں کے فوائد جمع ہونے کے بجائے دونوں کے نقصانات جمع ہو جانا زیادہ قریب از قیاس ہے۔ دوسرے یہ بھی خلاف عقل اور خلاف فطرت ہے کہ ایک مرتبہ اسلام کے شدید تر اخلاقی نظام کی بندشیں ڈھیلی کرنے اور نفوس کو قانون شکنی سے لذت آشنا کر دینے کے بعد آپ اس سلسلہ کو اسی حد پر روک رکھیں گے جس کو آپ نے خالی از مضرت سمجھ رکھا ہے۔ یہ نیم عریاں لباسوں کا رواج، یہ زینت و آرائش کا شوق، یہ دوستوں کی محفلوں میں بے باکی کے ابتدائی سبق، یہ سینما اور برہنہ تصویروں اور عشقی افسانوں سے بڑھتی ہوئی دلچسپی، یہ مغربی ڈھنگ پر لڑکیوں کی تعلیم، بہت ممکن ہے کہ اپنا فوری اثر نہ دکھائے، بہت ممکن ہے کہ موجودہ نسل اس کی مضرتوں سے محفوظ رہ جائے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ آیندہ نسلیں بھی اس سے محفوظ رہیں گی ایک صریح نادانی ہے۔ تمدن اور معاشرت میں ہر غلط طریقہ کی ابتدا بہت معصوم ہوتی ہے۔ مگر ایک نسل سے دوسری نسل اور دوسری سے تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے وہی ترقی کرکے ایک خوفناک غلطی بن جاتی ہے۔ خود یورپ اور امریکہ میں بھی جن غلط بنیادوں پر معاشرت کی تنظیم جدید کی گئی تھی اس کے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہو گئے تھے بلکہ اس کے پورے پورے نتائج اب تیسری اور چوتھی پشت میں ظاہر ہوئے ہیں۔ پس یہ مغربی اور اسلامی طریقوں کا امتزاج اور نیم بے حجابی دراصل کوئی مستقل اور پائدار چیز نہیں ہے، بلکہ اس کا فطری رجحان انتہائی مغربیت کی طرف ہے اور جو لوگ

اس طریقہ پر چل رہے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ انہوں نے دراصل اُس سفر کی ابتدا کی ہے جس کی آخری منزلوں تک اگر وہ نہیں تو ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد پہنچ کر رہے گی۔

منفعلین تیسرا گروہ سفہا، اور منفعلین کا ہے جن میں خود سوچنے، سمجھنے اور رائے قائم کرنے کی صلاحیت نہیں ہے یہ دوسروں کو جیسا کرتے دیکھتے ہیں ویسا ہی خود بھی کرنے لگتے ہیں، اور چونکہ خفیف العقل ہیں اس لیے طبعاً ان کا میلان ایسے طریقوں کی طرف ہوتا ہے جو انھیں خوشنما نظر آتے ہیں، اور جن پر چلنے والوں کو وہ خوش حال اور ترقی یافتہ پاتے ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت سب سے زیادہ خطرے میں ہیں، اگرچہ ان کا وبال پہلے اور دوسرے طبقہ پر ہے، اور انہی دونوں طبقوں کے درست ہونے یا بگڑ جانے پر ان کے بھی درست ہونے یا بگڑ جانے کا انحصار ہے۔

فیصلہ کن سوال اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے دو راستے الگ ہوتے ہیں۔ ایک راستہ مغربی تہذیب کا ہے، اور دوسرا راستہ اسلامی تہذیب کا۔ یہاں ہم کو فیصلہ کرنا ہے کہ کون کس راستہ کی طرف جانا چاہتا ہے، اور اس فیصلہ کا انحصار ایک بنیادی سوال پر ہے۔ سوال یہ ہے:۔

کیا آپ مغربی معاشرت کے اُن نتائج کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہیں جو یورپ اور امریکہ میں رونما ہو چکے ہیں، اور جو اس طرز معاشرت کے طبعی اور یقینی نتائج ہیں؟ کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں کہ آپ کی سوسائٹی میں بھی وہی ہیجان انگیز اور شہوانی ماحول پیدا ہو؟ آپ کی قوم میں بھی اسی طرح بے حیائی، بے عصمتی، اور فواحش کی کثرت ہو؟ امراض خبیثہ کی وبائیں پھیلیں؟ خاندان اور عائلی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جائے؟ طلاق اور تفریق کا زور ہو؟ نوجوان مرد اور عورتیں آزاد شہوت رانی کی خوگر ہو جائیں؟ برتھ کنٹرول اور اسقاط حمل اور قتل اولاد سے نسلیں منقطع کی جائیں؟ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں حد اعتدال سے بڑھی ہوئی

شہوانیت میں اپنی بہترین علمی قوتوں کو ضائع اور اپنی صحتوں کو برباد کریں؟ حتیٰ کہ کم سن بچوں تک میں قبل از وقت جنسی میلانات پیدا ہونے لگیں اور اس سے ان کے دماغی و جسمانی نشوونما میں ابتدا ہی سے فتور برپا ہو جایا کرے؟۔

اگر مادّی منفعتوں اور حسّی لذتوں کی خاطر آپ ان سب چیزوں کو گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں تو بلا تأمل مغربی راستے پر تشریف لے جائیے اور اسلام کا نام بھی اپنی زبان پر نہ لائیے۔ اس راستہ پر جانے سے پہلے آپ کو اسلام سے قطع تعلق کا اعلان کرنا پڑے گا تاکہ آپ بعد میں اس نام کو استعمال کر کے کسی کو دھوکہ نہ دے سکیں، اور آپ کی رسوائیاں اسلام اور مسلمانوں کے لیے موجب ننگ و عار نہ بن سکیں۔

لیکن اگر آپ ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور آپ کو ایک ایسے صالح اور پاکیزہ تمدن کی ضرورت ہے جس میں اخلاق فاضلہ اور ملکات شریفہ پرورش پا سکیں، جس میں انسان کو اپنی عقلی اور روحانی اور مادّی ترقی کے لیے ایک پرسکون ماحول مل سکے، جس میں عورت اور مرد اپنے اپنے تمدنی فرائض کو بہیمی جذبات کی خلل اندازی سے محفوظ رہ کر اپنی بہترین استعداد کے مطابق انجام دے سکیں، جس میں تمدن کا سنگ بنیاد یعنی خاندان پورے استحکام کے ساتھ قائم ہو، جس میں نسلیں محفوظ رہیں اور اختلاط انساب کا فتنہ برپا نہ ہو، جس میں انسان کی خانگی زندگی اس کے لیے سکون و راحت کی جنت، اور اس کی اولاد کے لیے مشفقانہ تربیت کا گہوارہ، اور خاندان کے تمام افراد کے لیے اشتراک عمل اور امداد باہمی کی انجمن ہو، تو ان مقاصد کے لیے آپ کو مغربی راستہ کا رخ بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ بالکل مخالف سمت کو جا رہا ہے اور مغرب کی طرف چل کر مشرق کو پہنچ جانا عقلاً محال ہے۔ اگر فی الحقیقت آپ کے مقاصد یہی ہیں تو آپ کو اسلام کا راستہ اختیار کرنا چاہیے لیکن اس راستہ پر قدم رکھنے سے

پہلے آپ کو ان غیر معتدل مادی منفعتوں اور حسی لذتوں کی طلب اپنے دل سے نکالنی ہوگی جو مغربی تمدن کے دلفریب مظاہر کو دیکھکر پیدا ہوگئی ہے۔ ان نظریات اور تخیلات سے بھی اپنے دماغ کو خالی کرنا ہوگا جو یورپ سے آپ نے مستعار لے رکھے ہیں۔ ان تمام اصولوں اور مقصدوں کو بھی طلاق دینا پڑے گا جو مغربی تمدن و معاشرت سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اسلام اپنے الگ اصول اور مقاصد رکھتا ہے، اس کے اپنے مستقل عمرانی نظریات ہیں۔ اُس نے ویسا ہی ایک نظام معاشرت وضع کیا ہے جیسا کہ اس کے مقاصد اور اس کے اصول اور اس کے عمرانی نظریات کا طبعی اقتضا ہے۔ پھر اس نظام معاشرت کا تحفظ وہ ایک خاص ڈسپلن اور ایک خاص ضابطہ کے ذریعہ سے کرتا ہے جس کے مقرر کرنے میں غایت درجہ کی حکمت اور نفسیاتِ انسانی کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، اور جس کے بغیر یہ نظام معاشرت اختلال و برہمی سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ افلاطون کی جمہوریت کی طرح کوئی خیالی اور وہمی نظام نہیں ہے، بلکہ ساڑھے تیرہ صدیوں کے زبردست امتحان میں پورا اتر چکا ہے، اور اس طویل مدت میں کسی ملک اور کسی قوم کے اندر بھی اس کے اثر سے ان خرابیوں کا عشر عشیر بھی رونما نہیں ہوا ہے جو مغربی تمدن کے اثر سے صرف ایک صدی کے اندر پیدا ہو چکی ہیں۔ پس اگر اس محکم اور آزمودہ نظام معاشرت سے آپ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو آپ کو اس کے ضابطہ اور اس کے ڈسپلن کی پوری پوری پابندی کرنی ہوگی، اور یہ حق آپ کو ہرگز حاصل نہ ہوگا کہ اپنی عقل سے نکالے ہوئے یا دوسروں سے سیکھے ہوئے نیم پختہ خیالات اور غیر آزمودہ طریقوں کو، جو اس نظام معاشرت کی طبیعت اور اس کے مزاج کے بالکل خلاف ہوں، خواہ مخواہ اس میں ٹھونسنے کی کوشش کریں۔

اب وہ گروہ جو مغربی تمدن کا راستہ علیٰ وجہ البصیرت اختیار کرتا ہے، ہمارا مخاطب نہیں ہے۔ ہمارا خطاب صرف ان لوگوں سے ہے جو اسلام کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور ان

شرائط کی پابندی پر آمادہ ہیں جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تفہیم ہمارے فرائض میں سے ہے، اور ان کو اسلامی نظم معاشرت کی روح، اس کے مقاصد، اس کے اصول، اس کے تحفظات اور اس کے ضوابط سے اچھی طرح روشناس کرا دینا ضروری ہے، تاکہ وہ بصیرت کی روشنی میں اس راستہ پر چل سکیں اور ان میں خود اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ جب کوئی خلاف اسلام طریقہ ان کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ اس کو پہچان لیں اور بلا تامل رد کر دیں۔ اس غرض کے لیے سب سے پہلے ہم یہ بتائیں گے کہ اسلامی نظام معاشرت کی فطری اور سائنٹفک بنیاد کیا ہے؟

صنفی کشش کی گیرائی

فطرت نے تمام انواع کی طرح انسان کو بھی "زوجین" یعنی دو کی ایسی صنفوں کی صورت میں پیدا کیا ہے جو ایک دوسرے کی جانب طبعی میلان رکھتی ہیں، دوسری انواع کا جس حد تک مطالعہ کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اس تقسیم اور اس طبعی یا صنفی میلان کا مقصد محض بقائے نوع ہے۔ اسی لیے ان میں یہ میلان صرف اس حد تک رکھا گیا ہے جس حد تک ہر نوع کے بقاء کے لیے ضروری ہے، اور ان کی جبلت میں ایسی قوت ضابطہ رکھدی گئی ہے جو انہیں صنفی تعلق میں اس حد مقرر سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ بخلاف اس کے انسان میں یہ میلان غیر محدود اور غیر منضبط اور تمام دوسری انواع سے بڑھا ہوا ہے۔ اس کے لیے وقت اور موسم کی کوئی قید نہیں۔ اس کی جبلت میں کوئی ایسی قوت ضابطہ بھی نہیں جو اسے کسی حد پر روک دے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کی طرف دائمی میلان رکھتے ہیں۔ ان کے اندر ایک دوسرے کی طرف جذب وانجذاب اور صنفی کشش کے غیر محدود اسباب فراہم کیے گئے ہیں۔ ان کے قلب میں صنفی محبت اور عشق کا ایک زبردست داعیہ رکھا گیا ہے۔ ان کے جسم کی ساخت اور اس کے تناسب اور اس کے رنگ روپ اور اس کے لمس اور اس کے ایک ایک جز میں

کشش پائی جاتی ہے، ان کی آواز، رفتار، گفتار، انداز و ادا ہر ایک میں کھینچ لینے کی قوت موجود ہے۔ گرد و پیش کی دنیا میں بھی بے شمار اسباب پھیلے ہوئے ہیں جو دونوں کے داعیات صنفی کو حرکت میں لاتے ہیں اور انھیں ایک دوسرے کی طرف مائل کرتے ہیں، جمال فطرت کا کوئی مظہر اور حسن کائنات کا کوئی جلوہ ایسا نہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس تحریک کا سبب نہ بنتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے جس دور میں انسان صنفی تعلق کے قابل نہیں ہوتا، اس میں نہ تو محبت اور عشق کے ولولے ہوتے ہیں، نہ مظاہر جمال میں سے کوئی چیز اس کے جذبات کو اپیل کرتی ہے، اور نہ وہ کسی شے میں کوئی کشش پاتا ہے۔ پھر انسان کے نظام جسمانی کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں طاقت کا جو زبردست خزانہ رکھا گیا ہے وہ بیک وقت قوت حیات اور قوت عمل بھی ہے، اور صنفی تعلق کی قوت بھی۔ وہی غدود جو اس کے اعضاء کو جیون رس (ہارمون) بہم پہنچاتے ہیں، چستی اور توانائی اور ذہانت اور عمل کی طاقت پیدا کرتے ہیں، انہی کے سپرد یہ خدمت بھی کی گئی ہے کہ اس میں صنفی تعلق کی قوت پیدا کریں، اس قوت کو حرکت میں لانے والے جذبات کی تخلیق کریں، ان جذبات کو ابھارنے کے لیے حسن اور روپ اور نکھار اور پھبن کے گوناگوں آلات بہم پہنچائیں، اور ان آلات سے متاثر ہونے کی قابلیت اس کی آنکھوں اور اس کے کانوں اور اس کی شامہ اور لامسہ حتیٰ کہ اس کی قوت متخیلہ تک میں فراہم کردیں۔ قدرت کی یہی کارفرمائی انسان کے قوائے نفسانی میں بھی نظر آتی ہے اس کے نفس میں جتنی محرک قوتیں پائی جاتی ہیں ان سب کا سر رشتہ دو زبردست داعیوں سے ملتا ہے۔ ایک وہ داعیہ جو اسے خود اپنے وجود کی حفاظت اور اپنی ذات کی خدمت پر ابھارتا ہے۔ دوسرا وہ داعیہ جو اس کو اپنے مقابل کی صنف سے تعلق پر مجبور کرتا ہے۔ انسان کے شباب کا زمانہ جو دراصل اس کے عمل کا زمانہ ہے، اس میں یہ دوسرا داعیہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ

بسا اوقات وہ پہلے داعیہ کو دبا لیتا ہے اور اس کے اثر سے انسان اس قدر مغلوب ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی جان تک دیدینے اور اپنے آپ کو جانتے بوجھتے ہلاکت میں ڈال دینے میں بھی تأمل نہیں ہوتا۔

تمدن کی تخلیق میں صنفی کشش کا اثر | یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ کیا محض بقائے نوع کے لیے؟ نہیں۔ کیونکہ نوع انسانی کو باقی رکھنے کے لیے اُس قدر تناسل کی بھی ضرورت نہیں جس قدر مچھلی اور بکری اور ایسی ہی دوسری انواع کے لیے ہے پھر کیا وجہ ہے کہ فطرت نے ان سب انواع سے زیادہ صنفی میلان انسان میں رکھا ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ اسباب فراہم کیے ہیں؟ کیا یہ محض انسان کے لطف اور لذت کے لیے ہے؟ یہ بھی نہیں۔ فطرت نے کہیں بھی لطف اور لذت کو مقصود بالذات نہیں بنایا ہے، بلکہ وہ کسی بڑے مقصد کی خدمت پر انسان اور حیوان کو مجبور کرنے کے لیے لطف اور لذت کو محض چاشنی کے طور پر لگا دیتی ہے تاکہ وہ اس خدمت کو غیر کا نہیں بلکہ اپنا کام سمجھ کر انجام دیں۔ اب غور کیجیے کہ اس معاملہ میں کونسا بڑا مقصد فطرت کے پیش نظر ہے؟ آپ جتنا غور کریں گے کوئی اور وجہ اس کے سوا سمجھ میں نہ آئے گی کہ فطرت، دوسری تمام انواع کے خلاف، نوع انسانی کو متمدن بنانا چاہتی ہے۔

اسی لیے انسان کے قلب میں صنفی محبت اور عشق کا جو داعیہ رکھا گیا ہے وہ محض جسمانی اتصال اور فعل تناسل کا طالب نہیں ہے بلکہ ایک دائمی معیت اور قلبی وابستگی اور روحانی لگاؤ کا طالب ہے۔

اسی لیے انسان میں صنفی میلان، اس کی قوت مباشرت سے بہت زیادہ رکھا گیا ہے۔ اس میں جتنی خواہش اور جتنی صنفی کشش رکھی گئی ہے، اگر اُسی نسبت سے، بلکہ ایک اور دس کی نسبت سے بھی وہ فعل تناسل کا ارتکاب کرے تو اس کی صحت جواب دے دے اور عمر طبعی کو پہنچنے

سے پہلے اس کی جسمانی قوتیں ختم ہو جائیں۔ یہ بات بھی اس امر کی دلیل ہے کہ انسان میں صنفی کشش کی زیادتی کا مقصود یہ نہیں کہ وہ تمام حیوانات سے بڑھ کر صنفی عمل کرے بلکہ اس سے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرنا اور ان کے باہمی تعلق میں استمرار و استقلال پیدا کرنا ہے۔

اسی لیے عورت کی فطرت میں صنفی کشش اور صنفی خواہش کے ساتھ ساتھ شرم و حیا، اور تمانع اور فرار اور رکاوٹ کا مادہ رکھا گیا ہے، جو کم و بیش ہر عورت میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرار اور منع کی کیفیت اگرچہ دوسرے حیوانات کے اناث میں بھی نظر آتی ہے مگر انسان کی صنف اناث میں اس کی قوت و کمیت بہت زیادہ ہے اور اس کو جذبۂ شرم و حیا کے ذریعہ سے اور زیادہ شدید کر دیا گیا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں صنفی مقناطیسیت کا مقصد ایک مستقل وابستگی ہے، نہ یہ کہ ہر صنفی کشش ایک صنفی عمل پر منتج ہو۔

اسی لیے انسان کے بچے کو تمام حیوانات کے بچوں سے زیادہ کمزور اور بے بس پیدا کیا گیا ہے۔ بخلاف دوسرے حیوانات کے انسان کا بچہ کئی سال تک ماں باپ کی حفاظت اور تربیت کا محتاج ہوتا ہے اور اس میں اپنے کو سنبھالنے اور اپنی مدد آپ کرنے کی قابلیت بہت دیر میں پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بھی یہ مقصود ہے کہ عورت اور مرد کا تعلق محض تعلق صنفی کی حد تک نہ رہے بلکہ اس تعلق کا نتیجہ ان کو باہمی تعاون اور تعامل پر مجبور کر دے۔

اسی لیے انسان کے دل میں اولاد کی محبت تمام حیوانات سے زیادہ رکھی گئی ہے حیوانات ایک قلیل مدت تک اپنے بچوں کی پرورش کرنے کے بعد ان سے الگ ہو جاتے ہیں پھر ان میں کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، بلکہ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں۔ بخلاف اس کے انسان ابتدائی پرورش کا زمانہ گذر جانے کے بعد بھی اولاد کی محبت میں گرفتار رہتا ہے،

تمام عمر گرفتار رہتا ہے، حتیٰ کہ یہ محبت اولاد کی اولاد تک منتقل ہوتی ہے، اور انسان کی خود غرض حیوانیت اِس کے اثر سے اس درجہ مغلوب ہو جاتی ہے کہ وہ جو کچھ اپنی ذات کے لیے چاہتا ہے اس سے زیادہ اپنی اولاد کے لیے چاہتا ہے اور اس کے دل میں اندر سے یہ امنگ پیدا ہوتی ہے کہ اپنی حدِ امکان تک اولاد کے لیے بہتر سے بہتر اسبابِ زندگی بہم پہنچائے اور اپنی محنتوں کے نتائج صرف انہی کے لیے چھوڑ جائے۔ اس شدید جذبۂ محبت کی تخلیق سے فطرت کا مقصد صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عورت اور مرد کے صنفی تعلق کو ایک دائمی رابطہ میں تبدیل کر دے، پھر اس دائمی رابطہ کو ایک خاندان کی ترکیب کا ذریعہ بنائے، پھر خونی رشتوں کی محبت کا سلسلہ بہت سے خاندانوں کو مصاہرت کے تعلق سے مربوط کرتا چلا جائے، پھر محبتوں اور محبوبوں کا اشتراک ان کے درمیان تعاوُن اور معاملت کا تعلق پیدا کر دے، اور اس طرح ایک نظامِ تمدّن وجود میں آجائے۔

تمدن کا بنیادی مسئلہ اس سے معلوم ہوا کہ یہ صنفی میلان جو انسانی جسم کے ریشے ریشے اور اس کے قلب و روح کے گوشے گوشے میں رکھا گیا ہے، اور جس کی مدد کے لیے بڑے وسیع پیمانے پر کائنات کے چپے چپے میں اسباب و محرکات فراہم کیے گئے ہیں، اس کا مقصد انسان کی انفرادیت کو اجتماعیت کی طرف مائل کرنا ہے، فطرتِ حق نے اس کو تمدّنِ انسانی کی اصلی قوتِ محرکہ بنایا ہے، اور اسی میلان و کشش کے ذریعہ سے وہ انسان کی دونوں صنفوں کو محبت اور تعاون کے رشتہ میں وابستہ کر کے ہیئت اجتماعی (سوسائٹی) اور معاشرت (سوشل لائف) کی بنیاد رکھتی ہے۔ جب یہ امر متحقق ہو گیا، تو یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ عورت اور مرد کے تعلق کا مسئلہ دراصل تمدّن کا بنیادی مسئلہ ہے اور اسی کے صحیح حل پر تمدن کی صلاح و فساد اور اس کی بہتری و بدتری، اور اس کے استحکام وضعف کا انحصار ہے۔ نوعِ انسانی کے ان دونوں حصوں

میں ایک تعلق تو محض حیوانی اور خالص صنفی اور سراسر شہوانی ہے، جس کا مقصود بقائے نوع کے سوا کچھ نہیں۔ دوسرا تعلق انسانی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں مل کر مشترک اغراض کے لیے اپنی اپنی استعداد اور اپنی اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق تعاون کریں، اور اس تعاون میں اُن کی صنفی محبت ایک واسطۂ اتصال کے طور پر کام دے۔ یہ دونوں قسم کے تعلقات بجائے خود ضروری ہیں، مگر تمدن کی صلاح و فساد کا مدار اس پر ہے کہ ان دونوں کا امتزاج نہایت متناسب اور معتدل ہو۔

مدنیت صالحہ کے لوازم آئیے اب ہم اس مسئلہ کا تجزیہ کر کے یہ معلوم کریں کہ ایک صالح تمدن کے لیے عورت اور مرد کے بہیمی اور انسانی تعلق میں معتدل اور متناسب امتزاج کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں اور اس امتزاج پر بے اعتدالی کی کن کن صورتوں سے تمدن فاسد ہو جاتا ہے۔

میلان صنفی کی تعدیل سب سے اہم اور مقدم سوال خود اس صنفی کشش اور میلان کا ہے جس کے متعلق اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ انسان پر اندر سے بھی محیط ہے اور باہر سے بھی، اور اس کے معلوم اور غیر معلوم محرکات و دواعی فطرت نے اس کثرت سے فراہم کیے ہیں کہ انسان ان کا شمار بھی نہیں کر سکتا۔ یہ چیز جس کے لیے فطرت نے خود اتنے انتظامات کیے ہیں اگر انسان بھی اپنی توجہ اور قوت ایجاد سے کام لے کر اس کی پرورش اور اس کی تکثیر کے اسباب مہیا کرے، اور ایسا طرز تمدن اختیار کرے جس میں اس کی صنفی پیاس بڑھتی چلی جائے، اور پھر اس پیاس کو بجھانے کی آسانیاں بھی پیدا کی جاتی رہیں، تو یہ چیز بڑھتے بڑھتے ایک ایسی دوزخ بن سکتی ہے جو انسان اور اس کے تمدن دونوں کو کھا جائے۔ صنفی تعلق اور اس کے مبادی اور اس کے محرکات میں سے ہر چیز کو فطرت نے لذیذ بنایا ہے، مگر جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں اس نے یہ لذت کی چاٹ محض اپنے مقصد یعنی تعمیر تمدن کے لیے لگائی

ننگائی ہے۔ اس چاٹ کا حد سے بڑھ جانا اور اسی میں انسان کا منہمک ہو جانا نہ صرف تمدن
بلکہ خود انسان کی بھی تخریب و ہلاکت کا موجب ہو سکتا ہے، اور ہو رہا ہے، اور بارہا ہو چکا ہے۔
جو قومیں تباہ ہو چکی ہیں ان کے آثار اور ان کی تاریخ کو دیکھیے۔ شہوانیت ان میں حد سے
متجاوز ہو چکی تھی۔ ان کے لٹریچر اسی قسم کے ہیجان انگیز مضامین سے لبریز پائے جاتے ہیں۔
ان کے تخیلات، ان کے افسانے، ان کے اشعار، ان کی تصویریں، ان کے مجسمے، ان کے
عبادت خانے، ان کے محلات سب کے سب اس پر شاہد ہیں۔ جو قومیں اب تباہی کی طرف
جا رہی ہیں ان کے حالات بھی دیکھ لیجیے۔ وہ اپنی شہوانیت کو آرٹ، اور لائٹ لٹریچر، اور
جمالیت اور ایسے کتنے ہی خوش نما اور معصوم ناموں سے موسوم کریں مگر تعبیر کے بدل جانے
سے حقیقت نہیں بدلتی۔ یہ کیا چیز ہے کہ سوسائٹی میں عورت کو عورتوں سے زیادہ مرد کی صحبت
اور مرد کو مردوں سے زیادہ عورت کی معیت مرغوب ہے؟ یہ کیوں ہے کہ عورتوں اور
مردوں میں تزئین و آرائش کا ذوق بڑھتا چلا جا رہا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ مخلوط
سوسائٹی میں عورت کا جسم لباس سے باہر ہوا جاتا ہے؟ وہ کونسی شئے ہے جس کے سبب سے
عورت اپنے جسم کے ایک ایک حصے کو کھول کھول کر پیش کر رہی ہے اور مردوں کی طرف سے
ہل من مزید کا تقاضا ہے؟ اس کی کیا علت ہے کہ برہنہ تصویریں، ننگے مجسمے اور عریاں ناچ سب سے
زیادہ پسند کیے جاتے ہیں؟ اس کا کیا سبب ہے کہ سینما میں اس وقت تک لطف ہی نہیں آتا
جب تک کہ عشق و محبت کی چاشنی نہ ہو اور اس پر صنفی تعلقات کے بہت سے قولی اور فعلی مبادی
کا اضافہ نہ کیا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے مظاہر اگر شہوانیت کے مظاہر نہیں تو کس
چیز کے ہیں؟ جس تمدن میں ایسا غیر معتدل شہوانی ماحول پیدا ہو جائے اس کا انجام تباہی
اور یقینی تباہی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ ایسے ماحول میں صنفی میلان کی شدت اور پیہم ہیجان

اور مسلسل تحریک سے نسلیں کمزور ہو جائیں گی، جسمانی اور عقلی قوتوں کا نشوونما بگڑ جائے گا۔ قوائے ذہنی پراگندہ ہو جائیں گے، فواحش کی کثرت ہوگی، امراض خبیثہ کی وبائیں پھیلیں گی، برتھ کنٹرول اور اسقاط حمل اور قتل اطفال جیسی تحریکیں وجود میں آئیں گی، مرد اور عورت بہائم کی طرح ملیں گے، بلکہ فطرت نے ان کے اندر جو صنفی میلان تمام حیوانات سے بڑھ کر رکھا ہے اس کو مقاصد فطرت کے خلاف استعمال کر کے وہ اپنی بہیمیت میں تمام حیوانات سے بازی لے جائیں گے، حتٰی کہ بندروں اور بکروں کو بھی مات کر دیں گے۔ ان کی بہیمیت انسانی تمدن و تہذیب بلکہ خود انسانیت کو بھی غارت کر دے گی، اور ان کا اخلاقی انحطاط ان کو ایسی پستی میں گرائے گا جہاں سے وہ پھر کبھی نہ اٹھ سکیں گے۔

ایسا ہی انجام اس تمدن کا بھی ہوگا جو تفریط کا پہلو اختیار کرے گا۔ جس طرح صنفی میلان کو حد اعتدال سے زیادہ بڑھانا مضر ہے اسی طرح اس کو حد سے زیادہ دبانا اور کچل دینا بھی مضر ہے۔ جو نظام تمدن انسان کو سنیاس اور برہمچرج اور رہبانیت کی طرف لیجانا چاہتا ہے وہ فطرت سے لڑتا ہے، اور فطرت اپنے مدمقابل سے کبھی شکست نہیں کھاتی بلکہ خود اسی کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ خالص رہبانیت کا تصور تو کسی تمدن کی بنیاد بن ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ دراصل تمدن و تہذیب کی نفی ہے۔ تاہم اس قسم کے تصورات کو دلوں میں راسخ کر کے انہی کے زیر اثر ایک شدید غیر صنفی ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے جس میں صنفی تعلق ایک ذلیل اور قابل نفرت اور گھناؤنی چیز سمجھی جائے اور اس سے اجتناب کو پسندیدہ قرار دیا جائے، اور ہر ممکن طریقے سے اس میلان کو دبانے کی کوشش کی جائے۔ مگر صنفی میلان کا دبنا دراصل انسانیت کا دبنا ہے۔ وہ خود ہی نہ دبے گا بلکہ انسان کی ذہانت اور قوت عمل، اور عقلی استعداد، اور حوصلہ و عزم، اور ہمت و شجاعت سب کو لئے کر دب جائیگا۔

اس کی ساری قوتیں ٹھٹھر کر رہ جائیں گی۔ اس کا خون سرد اور منجمد ہو جائے گا۔ اس میں ابھرنے کی کوئی صلاحیت ہی باقی نہ رہے گی، کیونکہ انسان کی سب سے بڑی قوتِ محرکہ یہی صنفی قوت ہے۔

پس صنفی میلان کو افراط و تفریط سے روک کر توسط و اعتدال کی حالت پر لانا، اور اسے ایک مناسب ضابطہ سے منضبط کرنا ایک صالح تمدن کا اولین فریضہ ہے۔ اس کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ وہ "ایک طرف ہیجان و تحریک کے ان تمام اسباب کو روک دے جن کو انسان خود اپنے ارادے اور اپنی لذت پرستی سے پیدا کرتا ہے، اور دوسری طرف طبعی و فطری تحریک کے لیے ایسا راستہ کھول دے جو خود منشارِ فطرت کے مطابق ہے۔ یعنی مرد اور عورت کی مستقل وابستگی جو ایک خاندان کی اساس بن جائے۔

نظامِ عائلی کا تحفظ خاندان کی تاسیس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ نظامِ عائلی کے تحفظ کا انتظام کیا جائے اور ایسے تمام اسباب کی روک تھام کی جائے جو اس نظام میں برہمی پیدا کرسکتے ہیں۔ مجرد فطرتِ حیوانی کے اعتبار سے دیکھیے تو مرد اور عورت کی صنفی کشش بجائے خود کسی ضابطہ سے آشنا نہیں ہے۔ جس طرح ہر آگ جلانے اور ہر آتش پذیر شے جل جانے کے لیے مستعد ہے، اور دونوں کا اجتماع اس کا مقتضی ہے کہ فعلِ سوزش واقع ہو، اسی طرح ہر مرد اور ہر عورت کے اندر ایک دوسرے کے لیے کشش موجود ہے اور یہ کشش ان کے اتصال کا اقتضا کرتی ہے۔ یہ فطرتِ حیوانی انسان کی جبلت میں پیوستہ ہے اور اصل و اساس کا حکم رکھتی ہے۔ اس کے اوپر فطرتِ انسانی ہے جس کا اقتضاء یہ ہے کہ صنفی تعلق میں استحکام اور پائداری ہو، بہائم کا سا انتشار نہ ہو کہ بلا امتیاز ہر کشش ایک اتصال کی صورت اختیار کرلے، انساب مخلوط نہ ہونے پائیں، اولاد اپنے معلوم و معروف ماں باپ سے ہو تاکہ والدین ان کی پرورش میں تعاون

کریں اور ان کے درمیان خونی رشتے قائم ہوں جو باہمی محبت و معاونت اور انتقال میراث کا ذریعہ بنیں۔ مگر فطرت انسانی کا یہ اقتضا اتنا طاقتور نہیں ہے کہ تنہا یہی انسان کو اس عقلی طریقہ کا پابند رکھنے کے لیے کافی ہو۔ فطرت حیوانی اس سے زیادہ طاقتور ہے، اور وہ اس سے جنگ کرنے پر آمادہ ہے۔ دنیا میں جس کثرت سے زنا کا ارتکاب ہو رہا ہے، اور جس کثرت سے تعلقات صنفی میں انتشار کی مثالیں ملتی ہیں وہ سب اسی فطرت حیوانی کے کرشمے ہیں، اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غیر معمولی "انسانیت" رکھنے والے آدمیوں کے سوا (جو بہت ہی کم ہوتے ہیں) عام انسان خواہ وہ مرد ہوں یا عورت، اس طاقت کو بالکل دبا دینے اور اپنے جذبات و افعال کو سراسر فطرت انسانی کے مقتضیات کا تابع رکھنے پر قادر نہیں ہیں پس ایک صالح تمدن کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ تعلقات صنفی کے لیے ازدواج کا ایک معروف طریقہ مقرر کر دے بلکہ اس کا فرض یہ بھی ہے کہ اس طریقہ کی حفاظت کا انتظام کرے تاکہ دائرۂ ازدواج سے باہر صنفی تعلقات کا انتشار روک دیا جائے اور دائرۂ ازدواج کے اندر دوسروں کی مداخلت بند کر دی جائے۔ فطرت حیوانی کے مقابلہ میں فطرت انسانی کو ہر موقع پر تمدن و تہذیب کے نظام سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے، چوری، لوٹ مار، قتل و خون، دغا و فریب، غصب حقوق اور دوسرے کثیر التعداد افعال جن کا ارتکاب فطرت حیوانی کے اثر سے کیا جاتا ہے، اس کی روک تھام کے لیے نظام تمدن ہی فطرت انسانی کی مدد کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جو فعل تمدن کی عین بنیاد پر حملہ کرتا ہے، اور جس کے محرکات ان تمام جرائم کے محرکات سے زیادہ قوی ہیں، اس کی روک تھام میں مدد دینے سے خود تمدن ہی انکار کر دے؟ جو تمدن اس معاملہ کو حقیر سمجھتا ہے اور اس کو محض ایک "خوش وقتی"[۱] قرار دیتا ہے۔ اور "آزادانہ تخم ریزی"[۲] کے ساتھ نہ صرف رواداری

---

[۱] تہذیب جدید میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے آزادانہ تعلق کو Having a good time سے تعبیر کیا جاتا ہے

[۲] Sowing wild oats یہ بھی تہذیب جدید کا ایک معروف محاورہ ہے۔

برتتا ہے، بلکہ اس کی اشاعت میں خود مددگار رہتا ہے وہ دراصل آپ اپنا دشمن ہے۔ وہ ہرگز ایک صالح تمدن نہیں ہے۔ صالح تمدن وہی ہو سکتا ہے جو اپنی خلاقی تعلیم سے دلوں میں اس چیز کی نفرت بٹھائے، اپنے قانون کی طاقت سے اس کو سختی کے ساتھ روکے اور نظام معاشرت کے ضوابط سے مردوں اور عورتوں کے تعلقات پر ایسی پابندیاں عائد کر دے کہ اگر وہ دائرۂ ازدواج کے باہر صنفی تعلق پیدا کرنے کی طرف مائل بھی ہوں تو ان کی راہ میں بہت سے مضبوط حجابات حائل ہو جائیں۔

اس معاملہ کو محض افراد کے اپنے باطنی احساس اور ان کے ضمیر کی آواز، اور ان کے اخلاقی وجدان اور تعلیم و تربیت کے اثرات پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ بلاشبہ تہذیب کی غایت یہی ہے کہ افراد کے باطن میں اتنی قوت پیدا کر دے کہ وہ خود بخود سوسائٹی کے قوانین کا احترام کریں، اور خود ان کا اپنا ضمیر ان کو اخلاقی ضوابط کی خلاف ورزی سے روک دے۔ اسی غرض کے لیے افراد کی تعلیم و تربیت کے لیے اتنی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر کیا آج تک تعلیم و تہذیب اپنی اس غایت کو پہنچنے میں اس حد تک کامیاب ہو سکی ہے کہ سوسائٹی کے نظام اور اخلاقی ضوابط کی حفاظت کے لیے خارج میں کسی انسدادی اور تعزیری تدبیر کی ضرورت باقی نہ رہی ہو؟ زمانہ قدیم اور "قرون مظلمہ" کو چھوڑیے۔ یہ بیسویں صدی، یہ "قرن منوّر" آپ کے سامنے موجود ہے۔ اس زمانہ میں یورپ اور امریکہ کے تہذیب ترین ممالک کو دیکھیے جن کا ہر باشندہ تعلیم یافتہ ہے، جن کو اپنے شہریوں کی اعلیٰ تربیت پر ناز ہے۔ کیا وہاں اس تعلیم اور تربیت اور تہذیب نے جرائم اور قانون شکنی کو روک دیا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے، اور اس روشن زمانہ میں بھی سوسائٹی کے نظم و آئین کو محض افراد کے اخلاقی وجدان پر نہیں چھوڑا جا سکا ہے، اور ہر اس فعل کو جسے جرم سمجھا جاتا ہے انسدادی اور تعزیری دونوں قسم کی تدبیروں سے روکنے کی

کوششیں اب بھی کی جا رہی ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ صرف صنفی تعلقات ہی کو اس عام قاعدے سے مستثنےٰ قرار دیا جائے؟ حالانکہ ان تعلقات کا انتشار تمدن کے لیے تمام جرائم سے زیادہ خطرناک ہے، اور اس جرم کے محرکات تمام جرائم کے محرکات سے زیادہ قوی اور کثیر ہیں۔ ہاں اگر یہ فعل جرم ہی نہیں ہے، بلکہ محض ایک "خوش وقتی" ہے جس کو برٹرینڈرسل کے بقول تھوڑی سی فراخ حوصلگی برت کر گوارا کر لینا چاہیے، تو اس کے لیے انسداد اور تعزیر کی بلاشبہہ ضرورت نہیں، بلکہ ایسی ذرا سی چیز کے لیے ضمیر اور اخلاقی وجدان میں بھی کوئی گرفتگی کیوں ہو؟

بعض حضرات کا ارشاد ہے کہ ناجائز صنفی تعلقات کو روکنے کے لیے عورتوں اور مردوں کے درمیان حجابات حائل کرنا، اور معاشرت میں ان کے آزادانہ اختلاط پر پابندیاں لگانا دراصل ان کے اخلاق اور ان کی سیرت پر ایک حملہ ہے۔ اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ گویا تمام افراد کو بدچلن فرض کر لیا گیا ہے، اور ایسی پابندیاں عائد کرنے والوں کو نہ اپنی عورتوں پر اعتبار ہے، نہ مردوں پر۔ بات نہایت معقول ہے۔ مگر اسی طرز استدلال کو ذرا آگے بڑھائیے۔ ہر قفل جو کسی دروازے پر لگایا جاتا ہے، گویا اس امر کا اعلان ہے کہ اس کے مالک نے تمام دنیا کو چور فرض کر لیا ہے۔ ہر پولیس مین کا وجود اس بات پر شاہد ہے کہ حکومت اپنی تمام رعایا کو بدمعاش سمجھتی ہے۔ ہر لین دین میں جو دستاویز لکھوائی جاتی ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ ایک فریق نے دوسرے فریق کو خائن قرار دیا ہے۔ ہر وہ انسدادی تدبیر جو ارتکاب جرائم کی روک تھام کے لیے اختیار کی جاتی ہے اس کے عین وجود میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ان سب لوگوں کو امکانی مجرم فرض کیا گیا ہے جن پر اس تدبیر کا اثر پڑتا ہے۔ اس طرز استدلال کے مطابق تو آپ ہر آن چور، بدمعاش، خائن اور مجرم قرار دیے جاتے ہیں مگر آپ کی عزت نفس کو ذرا سی بھی ٹھیس نہیں لگتی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ صرف اسی ایک معاملہ میں آپ کے احساسات

اس قدر نازک ہو گئے ہیں؟

درحقیقت یہ سب بہانے اس لیے گھڑے گئے ہیں کہ نفس شریر صنفی تعلقات میں آزادی اور اختلاط کے لیے بے تاب ہے اور اس پر کوئی پابندی اُسے گوارا نہیں ہے۔ مگر اسی شرارت نفس کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ اساس تمدن کی حفاظت کے لیے امتناعی تدابیر بھی اختیار کی جائیں اور تعزیری تدابیر بھی۔ انسان جب تک انسان ہے، اور اس کی جبلت میں بہیمیت موجود ہے اس وقت تک کوئی ایسا تمدن ان تدابیر سے غافل نہیں ہو سکتا جو اشخاص کی خواہشات اور ان کے لطف و لذت سے بڑھ کر سوسائٹی کی صلاح کو عزیز رکھتا ہو۔

تعلق زوجین کی صحیح صورت | نظام عائلی کے تحفظ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مرد اور عورت کے تعلق کی صحیح نوعیت متعین ہو، ان کے حقوق و فرائض عدل کے ساتھ مقرر کیے جائیں، ذمہ داریاں ان پر ٹھیک ٹھیک تقسیم ہوں اور خاندان میں ان کے مراتب اور ان کے وظائف کا تقرر اس طور پر ہو کہ اعتدال اور تناسب میں فرق نہ آنے پائے۔ تمدن و معاشرت کے جملہ مسائل میں یہ مسئلہ سب سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس کے صحیح حل پر نہ صرف نظام عائلی بلکہ پورے نظام تمدن و تہذیب کی صحت و صلاح کا مدار رہے، اور بڑے بڑے تمدن اس کے حل میں ناکام ہوئے ہیں۔

بعض قومیں ایسی ہیں جن میں عورت کو مرد پر قوّام بنایا گیا ہے مگر تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ ان قوموں میں سے کوئی قوم اعلیٰ درجہ کی تہذیب کی مالک ہوئی ہو۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ایسی ایک قوم بھی آج تک دنیا میں نہیں ابھر سکی۔ اس نے کوئی عزت اور طاقت حاصل کی۔ نہ کوئی کارنمایاں انجام دیا۔

بیشتر اقوام عالم میں مرد کو عورت پر قوّام بنایا گیا ہے، مگر اس ترجیح نے اکثر ظلم کی شکل اختیار کر لی۔ عورت کو لونڈی بنا کر رکھا گیا۔ اس کی تذلیل و تحقیر کی گئی۔ اس کو کسی

قسم کے معاشی اور تمدنی حقوق نہ دیے گئے۔ اس کو خاندان میں ایک ادنیٰ خدمت گار اور مرد کے لیے آلۂ شہوت رانی بنا کر رکھا گیا۔ خاندان سے باہر عورتوں کے ایک گروہ کو کسی حد تک علم اور تہذیب کے زیوروں سے آراستہ بھی کیا گیا تو اس لیے کہ وہ مردوں کے صنفی مطالبات زیادہ دلاویز طریقہ سے پورے کریں، ان کے لیے اپنی موسیقی سے لذت گوش، اور اپنے رقص اور ناز و ادا سے لذت نظر، اور اپنے صنفی کمالات سے لذت جسم بن جائیں۔ یہ عورت کی توہین و تذلیل کا سب سے زیادہ شرمناک طریقہ تھا جو مرد کی نفس پرستی نے ایجاد کیا۔

مغربی تمدن نے تیسرا پہلو اختیار کیا ہے، یعنی مردوں اور عورتوں میں مساوات ہو، دونوں کی ذمہ داریاں یکساں اور قریب قریب ایک ہی طرح کی ہوں، دونوں ایک ہی حلقۂ عمل میں مسابقت کریں، دونوں اپنی روزی آپ کمائیں اور اپنی ضروریات کے آپ کفیل ہوں۔ معاشرت کی تنظیم کا یہ قاعدہ بالکل جدید ہے، اور ابھی تک تکمیل کو نہیں پہنچا ہے، کیونکہ مرد کی فضیلت و برتری اب بھی نمایاں ہے زندگی کے کسی شعبہ میں بھی عورت مرد کی ہم پلہ نہیں ہے۔ نہ اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہوئے ہیں جو کامل مساوات کی صورت میں اس کو ملنے چاہییں۔ لیکن جس حد تک مساوات قائم کی گئی ہے اس نے ابھی سے نظام تمدن میں فساد برپا کر دیا ہے، حالانکہ ابھی اس جدید تنظیم کو شروع ہوئے پوری ایک قرن بھی نہیں گذری ہے۔ اس مضمون کی ابتدا میں ہم تفصیل کے ساتھ اس کے نتائج بیان کر چکے ہیں، لہٰذا اس پر کسی مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

یہ تینوں قسم کے تمدن عدل اور توازن اور تناسب سے خالی ہیں کیونکہ انہوں نے فطرت کی رہنمائی کو سمجھنے اور ٹھیک ٹھیک اس کے مطابق طریقہ اختیار کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ اگر عقل سلیم سے کام لے کر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فطرت خود ان مسائل کا صحیح حل

بتا رہی ہے بلکہ یہ بھی در اصل فطرت ہی کی زبردست طاقت ہے جس کے اثر سے عورت نہ تو اس حد تک گر سکی جس حد تک اسے گرانے کی کوشش کی گئی، اور نہ اس حد تک بڑھ سکی جس حد تک اس نے بڑھنا چاہا یا مردنے اسے بڑھانے کی کوشش کی۔ افراط و تفریط کے دونوں پہلو انسان نے غلط اندیش عقل اور اپنے بہکے ہوئے تخیلات کے اثر سے اختیار کئے ہیں، مگر فطرت عدل اور تناسب چاہتی ہے، اور خود اس کی صورت بتاتی ہے۔

اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ انسان ہونے میں مرد اور عورت دونوں مساوی ہیں۔ دونوں نوع انسانی کے دو مساوی حصے ہیں۔ تمدن کی تعمیر اور تہذیب کی تاسیس و تشکیل، اور انسانیت کی خدمت میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ دل، دماغ، عقل، جذبات، خواہشات اور بشری ضروریات دونوں رکھتے ہیں۔ تمدن کی صلاح و فلاح کے لیے دونوں کی تہذیب نفس، دماغی تربیت اور عقلی و فکری نشوونما یکساں ضروری ہے تاکہ تمدن کی خدمت میں ہر ایک اپنا اپنا پورا حصہ ادا کر سکے۔ اس اعتبار سے مساوات کا دعویٰ بالکل صحیح ہے، اور ہر صالح تمدن کا فرض یہی ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی اپنی فطری استعداد اور صلاحیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ ترقی کرنے کا موقع دے، ان کو علم اور اعلیٰ تربیت سے مزین کرے، انھیں بھی مردوں کی طرح تمدنی و معاشی حقوق ادا کرے، اور معاشرت میں عزت کا مقام ان کو بخشے تاکہ ان میں عزت نفس کا احساس پیدا ہو اور ان کے اندر وہ بہترین بشری صفات پیدا ہوسکیں جو صرف عزت نفس ہی کے احساس سے پیدا ہوسکتی ہیں۔ جن قوموں نے اس قسم کی مساوات سے انکار کیا ہے، جنہوں نے اپنی عورتوں کو جاہل، نا تربیت یافتہ، ذلیل اور حقوق مدنیت سے محروم رکھا ہے وہ خود پستی کے گڑھے میں گر گئی ہیں، کیونکہ انسانیت کے پورے نصف حصہ کو گرا دینے کے معنی خود انسانیت کو گرا دینے کے ہیں۔ ذلیل ماؤں کی

گودیوں سے عزت والے، اور ناتربیت یافتہ ماؤں کی آغوش سے اعلیٰ تربیت والے، اور پست خیال ماؤں کے گہوارے سے اونچے خیال والے انسان نہیں نکل سکتے۔

لیکن مساوات کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں کا حلقۂ عمل ایک ہی ہو، دونوں ایک ہی سے کام کریں، دونوں پر زندگی کے تمام شعبوں کی ذمہ داریاں یکساں عائد کر دی جائیں، اور نظام تمدن میں دونوں کی حیثیتیں بالکل ایک سی ہوں۔ اس کی تائید میں سائنس کے مشاہدات اور تجربات سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ عورت اور مرد اپنی جسمانی استعداد و قوت کے لحاظ سے مساوی (equipotential) ہیں۔ مگر صرف یہ امر کہ ان دونوں میں اس قسم کی مساوات پائی جاتی ہے، اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ فطرت کا مقصود بھی دونوں سے ایک ہی طرح کے کام لینا ہے۔ ایسی رائے قائم کرنا اُس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ دونوں کے نظام جسمانی بھی یکساں ہیں، دونوں پر فطرت نے ایک ہی جیسی خدمات کا بار بھی ڈالا ہے۔ اور دونوں کی نفسی کیفیات بھی ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ انسان نے اب تک جتنی سائنٹفک تحقیقات کی ہے اس سے ان تینوں تنقیحات کا جواب نفی میں ملتا ہے۔

علم الحیات (Biology) کی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ عورت اپنی نمایاں جسدی خصوصیات سے لیکر جسمی خلایا کے پروٹینی ذرات (Protein molecules of tissue cells) تک میں مرد سے مختلف ہے۔ جس وقت رحم میں بچے کے اندر صنفی تشکیل (Sex formation) واقع ہوتی ہے اسی وقت سے دونوں صنفوں کا جسدی ارتقاء بالکل ایک دوسرے سے مختلف صورت میں ہوتا ہے۔ عورت کا پورا نظام جسمانی اس طور پر بنایا جاتا ہے کہ وہ بچہ جننے اور اس کی پرورش کرنے کے لیے مستعد ہو۔ ابتدائی

جنینی تشکیل سے لے کر سن بلوغ کو پہنچنے تک اس کے جسم کا پورا نشو ونما اسی استعداد کی تکمیل کے لیے ہوتا ہے، اور یہی چیز اس کی آیندہ زندگی کا راستہ معین کرتی ہے۔ بالغ ہونے پر ایام ماہواری کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کے اثر سے اس کے جسم کے تمام اعضاء کی فعلیت متاثر ہو جاتی ہے۔ اکابر فن حیاتیات وعضویات کے مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام ماہواری میں عورت کے اندر حسب ذیل تغیرات ہوتے ہیں۔

۱۔ درجہ حرارت کم ہو جاتا ہے جسم میں حرارت کو روکنے کی قوت کم ہو جاتی ہے اس لیے حرارت زیادہ مقدار میں خارج ہوتی ہے۔

۲۔ نبض سست ہو جاتی ہے۔ خون کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ خلایائے دم کی تعداد میں فرق واقع ہوتا ہے۔

۳۔ Lymphatic glands, tonsils & endocrines میں تغیر واقع ہوتا ہے

۴۔ پروٹینی تحول Protein metabolism میں کمی آجاتی ہے۔

۵۔ فاسفیٹس اور کلورائیڈس کے اخراج میں کمی اور ہوائی تحول (Gaseous metabolism) میں انحطاط رونما ہوتا ہے۔

۶۔ ہضم، اور غذا کے پروٹینی اجزاء اور چربی کے جزو بدن بننے میں کمی ہو جاتی ہے۔

۷۔ تنفس کی قابلیت میں کمی اور گویائی کے اعضاء میں خاص تغیرات واقع ہوتے ہیں۔

۸۔ عضلات میں سستی اور احساسات میں بلادت آجاتی ہے۔

۹۔ ذہانت اور خیالات کو مرکوز کرنے کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔

یہ تغیرات ایک تندرست عورت کو بیماری کی حالت سے اس قدر قریب کر دیتے ہیں کہ درحقیقت اس وقت صحت اور مرض کے درمیان کوئی واضح خط کھینچنا مشکل ہوتا ہے۔ اس سے

زیادہ شدید وہ تغیرات ہیں جو نظام عصبی کے اعلیٰ مراکز اور درون افرازی غدد (endocrine glands) میں ہوتے ہیں۔ انہی اعضاء کے صحیح فعل پر تندرستی کا انحصار ہے، مگر ایام ماہواری میں ان کے فعل میں اختلال واقع ہوجاتا ہے۔ اور ایک مضطربانہ کیفیت رہتی ہے۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں ڈاکٹر (Voicechevsky) نے گہرے مشاہدہ کے بعد یہ نتیجہ ظاہر کیا تھا کہ اس زمانہ میں عورت کے اندر مرکزیت خیال اور دماغی محنت کی طاقت کم ہوجاتی ہے۔ پروفیسر (Krschiskovsky) نفسیاتی مشاہدات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس زمانہ میں عورت کا نظام عصبی نہایت اشتعال پذیر ہوجاتا ہے۔ احساسات میں بلادت اور ناہمواری پیدا ہوجاتی ہے، مرتب انعکاسات کو قبول کرنے کی صلاحیت کم اور بسااوقات باطل ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ پہلے سے حاصل شدہ مرتب انعکاسات میں بھی بدنظمی پیدا ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے اس کے وہ افعال بھی درست نہیں رہتے جن کی وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں خوگر ہوتی ہے۔ ایک عورت جو ٹرام کی کنڈکٹر ہے اس زمانہ میں غلط ٹکٹ کاٹ دے گی اور ریزگاری گننے میں الجھے گی۔ ایک موٹر ڈرائیور عورت گاڑی آہستہ اور ڈرتے ڈرتے چلائے گی اور ہر موڑ پر گھبرا جائے گی۔ ایک لیڈی ٹائپسٹ غلط ٹائپ کرے گی، دیر میں کرے گی اور کوشش کے باوجود الفاظ چھوڑ جائے گی، غلط جملے بنائے گی، کسی حرف پر انگلی مارنی چاہے گی اور ہاتھ کسی حرف پر جا پڑے گا۔ ایک بیرسٹر عورت کی قوت استدلال درست نہ رہے گی اور اپنے مقدمہ کو پیش کرنے میں اس کا دماغ اور اس کی قوت بیان دونوں غلطی کریں گے۔ ایک مجسٹریٹ عورت کی قوت فہم اور قوت فیصلہ دونوں متاثر ہوجائیں گی۔ ایک دندان ساز عورت کو اپنا کام کرتے وقت مطلوبہ اوزار مشکل سے ملیں گے۔ ایک گانے والی عورت اپنے لہجہ اور آواز کی خوبی کو کھو دے گی، حتیٰ کہ ایک ماہر نظقیات

محض آواز سن کر بتا سکتا ہے کہ گانے والی اس وقت حالت حیض میں ہے۔ غرض یہ کہ اس زمانہ میں عورت کے دماغ اور اعصاب کی مشین بڑی حد تک سست اور غیر مرتب ہو جاتی ہے۔ اس کے اعضاء پوری طرح اس کے ارادہ کے تحت عمل نہیں کر سکتے بلکہ اندر سے ایک اضطراری حرکت اس کے ارادے پر غالب آکر اس کی قوت ارادی اور قوت فیصلہ کو ماؤف کر دیتی ہے، اور اس سے مجبورانہ افعال سرزد ہونے لگتے ہیں۔ ایسی حالت میں اس کی آزادی عمل باقی نہیں رہتی، اور وہ کوئی ذمہ دارانہ کام کرنے کے قابل نہیں ہوتی

پروفیسر لاپنسکی Lapinsky اپنی کتاب The Development of Personality in woman میں لکھتا ہے کہ زمانہ حیض عورت کو اس کی آزادی عمل سے محروم کر دیتا ہے۔ وہ اس وقت اضطراری حرکات کی غلام ہوتی ہے اور اس میں بالارادہ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی قوت بہت کم ہو جاتی ہے۔

یہ سب تغیرات ایک تندرست عورت میں ہوتے ہیں، اور بآسانی ترقی کر کے مرض کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ ریکارڈ پر ایسے واقعات بکثرت موجود ہیں کہ اس حالت میں عورتیں دیوانی سی ہو جاتی ہیں۔ ذرا سے اشتعال پر غضبناک ہو جانا وحشیانہ اور احمقانہ حرکات کر بیٹھنا حتیٰ کہ خودکشی تک کر گذرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ڈاکٹر (Krafft-Ebing) لکھتا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو عورتیں نرم مزاج، سلیقہ مند اور خوش خلق ہوتی ہیں ان کی حالت ایام ماہواری کے آتے ہی یکایک بدل جاتی ہے۔ یہ زمانہ ان کے اوپر گویا ایک طوفان کی طرح آتا ہے۔ وہ چڑچڑی اور جھگڑالو اور کٹکھنی ہو جاتی ہیں نوکر اور بچے اور شوہر ان سے نالاں ہوتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اجنبی لوگوں سے بھی بری طرح پیش آتی ہیں۔ بعض دوسرے اہل فن گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عورتوں سے

اکثر جرائم حالت حیض میں سرزد ہوتے ہیں کیونکہ وہ اس وقت اپنے قابو میں نہیں ہوتیں ایک اچھی خاصی نیک عورت اس زمانے میں چوری کر گذرے گی اور بعد میں خود اس کو اپنے فعل پر شرم آئے گی (Weinherg اپنے مشاہدات کی بنا پر لکھتا ہے کہ خودکشی کرنے والی عورتوں میں ۵۰ فیصدی ایسی پائی گئی ہیں جنہوں نے حالت حیض میں یہ فعل کیا ہے۔ اسی بنا پر ڈاکٹر کرافٹ ایبنگ کی رائے یہ ہے کہ بالغ عورتوں پر جب کسی جرم کی پاداش میں مقدمہ چلایا جائے تو عدالت کو اس امر کی تحقیق کر لینی چاہیے کہ آیا یہ جرم حالت حیض میں تو نہیں کیا گیا ہے۔

ایام ماہواری سے بھی بڑھ کر حمل کا زمانہ عورت پر سخت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ریپریف (Reprev) لکھتا ہے کہ حمل کے زمانہ میں عورت کے جسم سے فضلات کا اخراج کا نظام بسا اوقات فاقہ زدگی کی حالت سے بھی زیادہ کم مقدار میں ہوتا ہے اس زمانہ میں عورت کسی طرح بھی جسمانی اور دماغی محنت کا وہ بار نہیں سنبھال سکتا جو حمل کے ماسوا ایام میں سنبھال سکتا ہے۔ جو حالات اس زمانہ میں عورت پر گذرتے ہیں وہ اگر مرد پر گذریں یا غیر زمانہ حمل میں خود عورت پر گذریں تو قطعی بیماری کا حکم لگا دیا جائے۔ اس زمانہ میں کئی مہینے تک اس کا نظام عصبی مختل رہتا ہے۔ اس کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس کے تمام عناصر روحی ایک مسلسل بدنظمی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ وہ مرض اور صحت کے درمیان معلق رہتی ہے اور ایک ادنیٰ سی وجہ اس کو بیماری کی سرحد میں پہنچا سکتی ہے۔ ڈاکٹر فشر کا بیان ہے کہ ایک تندرست عورت بھی حمل کے زمانہ میں سخت نفسی اضطراب میں مبتلا ہوتی ہے۔ اس میں تلون پیدا ہو جاتا ہے۔ خیالات پریشان رہتے ہیں۔ ذہن پراگندہ ہوتا ہے۔ شعور اور غور و فکر اور سمجھ بوجھ کی صلاحیت بہت کم ہو جاتی ہے۔

وضع حمل کے بعد متعدد بیماریوں کے رونما ہونے اور ترقی کرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ زچگی کے زخم زہریلے اثرات قبول کرنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔ قبل حمل کی حالت کی طرف واپس جانے کے لیے اعضا میں ایک حرکت شروع ہوتی ہے جو سارے نظام جسمانی کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ اگر کوئی خطرہ نہ بھی پیش آئے تب بھی کئی ہفتے اس کو اپنی اصلی حالت پر آنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح استقرار حمل کے بعد سے پورے ایک سال تک عورت درحقیقت اس قابل نہیں ہوتی کہ اس پر کسی جسمانی یا دماغی محنت کا بار ڈالا جائے۔

پھر رضاعت کا زمانہ ایسا ہوتا ہے جس میں درحقیقت وہ اپنے لیے نہیں جیتی بلکہ اس امانت کے لیے جیتی ہے جو فطرت نے اس کے سپرد کی ہے۔ اس کے جسم کا جوہر اس کے بچے کے لیے دودھ بنتا ہے۔ جو کچھ غذا وہ کھاتی ہے اس میں سے صرف اس قدر حصہ اس کے جسم کو ملتا ہے جس قدر اسے زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ باقی سب کا سب دودھ کی پیدائش میں صرف ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی ایک مدت دراز تک بچہ کی پرورش نگہداشت اور تربیت پر اس کو تمام تر اپنی توجہ صرف کرنی پڑتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسئلہ رضاعت کا یہ حل نکالا گیا ہے کہ بچوں کو خارجی غذاؤں پر رکھا جائے۔ لیکن یہ کوئی صحیح حل نہیں ہے۔ اس لیے کہ فطرت نے بچہ کی پرورش کا جو سامان ماں کے سینے میں رکھ دیا ہے اس کا صحیح بدل اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ بچے کو اس سے محروم کرنا ظلم اور خود غرضی کے سوا کچھ نہیں۔ اسی طرح تربیت اطفال کے لیے بھی نرسنگ ہوم اور تربیت گاہ اطفال کی تجویزیں نکالی گئی ہیں تاکہ مائیں اپنے بچوں سے بے فکر ہو کر بیرون خانہ کے مشاغل میں منہمک ہو سکیں لیکن کسی نرسنگ ہوم اور کسی تربیت گاہ میں شفقت مادری فراہم نہیں کی جا سکتی۔ طفولیت کا ابتدائی زمانہ جس محبت جس دردمندی اور جس خیرسگالی کا محتاج ہے وہ کرایہ کی اپنی پوسنے والیوں کے سینے میں

کہاں سے آسکتی ہے۔ تربیت اطفال کے یہ جدید طریقے ابھی تک آزمودہ نہیں ہیں۔ ابھی وہ نسلیں پھل پھول بھی نہیں لائی ہیں جو بچے پلنے کے ان نئے کارخانوں میں تیار کی گئی ہیں۔ ابھی تک ان کی سیرت ان کے اخلاق، ان کے کارنامے دنیا کے سامنے نہیں آئے ہیں کہ اس تجربے کی کامیابی و ناکامی کے متعلق کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ لہذا اس طریقہ کے متعلق یہ دعوی کرنا قبل از وقت ہے کہ دنیا نے ماں کی آغوش کا صحیح بدل پالیا ہے۔ کم از کم اس وقت تک تو یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ بچے کی فطری تربیت گاہ اس کی ماں کی آغوش ہی ہے۔

اب یہ بات ایک معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر عورت اور مرد دونوں کی جسمانی اور دماغی قوت و استعداد بالکل مساوی بھی ہے، تب بھی فطرت نے دونوں پر مساوی بار نہیں ڈالا ہے۔ بقائے نوع کی خدمت میں تخم ریزی کے سوا اور کوئی کام مرد کے سپرد نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد وہ بالکل آزاد ہے کہ زندگی کے جس شعبے میں چاہے کام کرے۔ بخلاف اس کے اس خدمت کا پورا بار عورت پر ڈالدیا گیا ہے۔ اسی بار کے سنبھالنے کے لیے اس کو اس وقت سے مستعد کیا جاتا ہے جب کہ وہ ماں کے پیٹ میں محض ایک مضغۂ گوشت ہوتی ہے۔ اسی کے لیے اس میں انفعال و تاثر، نرمی و نزاکت، رحم و شفقت، ذکاوتِ حس اور لطافت جذبات کی صفتیں پیدا کی گئی ہیں جو اسے زندگی کے صرف منفعلانہ پہلو کو قبول کرنے کے لیے تیار کرتی ہیں، اور ایسے کاموں کے قابل نہیں بناتیں جو شدت اور سختی اور تحکم اور مزاحمت کے طالب ہیں۔

اسی کے لیے اس پر جوانی کے پورے زمانے میں پیہم ایام ماہواری کے دورے آتے ہیں جو ہر مہینے میں تین سے لیکر دس دن تک اس کو کسی بڑی ذمہ داری کا بار سنبھالنے اور کوئی اہم جسمانی یا دماغی محنت کرنے کے قابل نہیں رکھتے۔ اسی کے لیے اس پر حمل اور مابعد حمل کا پورا ایک سال سختیاں جھیلتے گذرتا ہے جس میں وہ درحقیقت نیم جان ہوتی ہے۔ اسی کے لیے اس پر رضاعت

کے پورے دو سال اس طرح گذرتے ہیں کہ وہ اپنے خون سے انسانیت کی کھیتی کو سینچتی اور اپنے سینے کی نہروں سے اس کو سیراب کرتی ہے۔ اسی کے لیے اس پر بچے کی ابتدائی پرورش کے کئی سال اس محنت و مشقت میں گذرتے ہیں کہ اس پر رات کی نیند اور دن کی آسائش حرام ہوتی ہے اور وہ اپنی راحت، اپنے لطف، اپنی خوشی، اپنی خواہشات، غرض ہر چیز کو آنے والی نسل پر قربان کر دیتی ہے۔ جب حال یہ ہے تو غور کیجیے کہ عدل کا تقاضا کیا ہے؟ کیا عدل یہی ہے کہ عورت سے اُن فطری ذمہ داریوں کی بجا آوری کا مطالبہ بھی کیا جائے جن میں مرد اس کا شریک نہیں ہے، اور پھر ان تمدنی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اس پر مرد کے برابر ڈال دیا جائے جن کو سنبھالنے کے لیے مرد فطرت کی تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہے؟ اُس سے کہا جائے کہ تو وہ ساری مصیبتیں بھی برداشت کر جو فطرت نے تیرے اوپر ڈالی ہیں اور ہمارے ساتھ آکر روزی کمانے کی مشقتیں بھی اُٹھا، سیاست اور عدالت اور صنعت و حرفت، اور تجارت و زراعت اور قیام امن اور مدافعتِ وطن کی خدمتوں میں بھی برابر کا حصہ لے، ہماری سوسائٹی میں آکر ہمارا دل بھی بہلا، ہمارے لیے عیش و مسرت اور لطف و لذت کے سامان بھی فراہم کر؟ یہ عدل نہیں ظلم ہے، مساوات نہیں صریح نامساوات ہے۔ عدل کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے کہ جس پر فطرت نے بہت زیادہ بار ڈالا ہے اس کو تمدن کے ہلکے اور سبک کام سپرد کیے جائیں۔ اور جس پر فطرت نے کوئی بار نہیں ڈالا اس پر تمدن کی اہم اور زیادہ محنت طلب ذمہ داریوں کا بار ڈالا جائے، اور اسی کے سپرد یہ خدمت بھی کی جائے کہ وہ خاندان کی پرورش اور اس کی حفاظت کرے۔

یہ وہ تقسیم عمل ہے جو خود فطرت نے انسان کی دونوں صنفوں کے درمیان کر دی ہے اس فطری تقسیم کے لحاظ سے ایک صالح تمدن وہی ہو سکتا ہے جو عورت کو معاشرت میں عزت کا مقام

اور تمدن و معیشت میں جائز حقوق دینے کے ساتھ اس پر صرف گھر کی ذمہ داریوں کا بار ڈالتا ہے، اور مرد کو بیرون خانہ کی ذمہ داریاں اور خاندان کی قوامیت سپرد کرتا ہے جو تمدن اس تقسیم کو مٹانے کی کوشش کرے گا وہ ممکن ہے کہ عارضی طور پر مادی حیثیت سے ترقی اور شان و شوکت کے کچھ مظاہر پیش کر دے، لیکن ایسے تمدن کی بربادی یقینی ہے، کیونکہ جب عورت پر مرد کے برابر معاشی و تمدنی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا جائے گا تو وہ اپنے اوپر سے فطری ذمہ داریوں کا بوجھ اتار پھینکے گی اور اس کا نتیجہ نہ صرف تمدن بلکہ خود انسانیت کی بربادی ہوگا عورت اپنی افتاد طبع اور فطری ساخت کے خلاف اگر کوشش کرے تو کسی نہ کسی حد تک مرد کے سب کاموں کا بوجھ سنبھال لے جائے گی۔ لیکن مرد کسی طرح بھی اپنے آپ کو بچے جننے اور بچے پالنے کے قابل نہیں بنا سکتا۔

اب اگر فطرت کی اس تقسیم عمل کو ملحوظ رکھکر خاندان کی تنظیم اور معاشرت میں مرد اور عورت کے مراتب و وظائف کی تعیین کی جائے تو اس کے ضروری ارکان یہ ہوں گے۔

۱۔ خاندان کے لیے روزی کمانا، اس کی حفاظت و حمایت کرنا، اور تمدن کی محنت طلب خدمات انجام دینا مرد کا کام ہو۔ اور اس کی تعلیم و تربیت ایسی ہو کہ وہ ان اغراض کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بن سکے۔

۲۔ خانہ داری کے فرائض، بچوں کی پرورش اور گھر کی زندگی کو سکون و راحت کی جنت بنانا عورت کا کام ہو اور انہی اغراض کے لیے اس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے تیار کیا جائے۔

۳۔ خاندان کے نظم کو برقرار رکھنے اور اس کو انارکی سے بچانے کے لیے ایک فرد کو ضروری حاکمانہ اختیارات حاصل ہوں تاکہ خاندان ایک بن سری فوج نہ بن جائے۔ ایسا فرد صرف مرد ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ جس رکن خاندان کی دماغی اور قلبی حالت بار بار ایام ماہواری اور حمل کے زمانہ میں بگڑتی رہتی ہو وہ ان اختیارات کو استعمال کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

۴۔ تمدن کے نظام میں اس تقسیم اور اس ترتیب و تنظیم کو برقرار رکھنے کے لیے ایسے تحفظات رکھے جائیں جن سے عورتوں اور مردوں کے حلقہائے عمل مخلوط نہ ہو سکیں۔ (باقی)